اسلام سلمانؓ کے لیے، ۱/ ۱۴۲ وما بعد، بخاری/ فتح الباری، کتاب مناقب الانصار۔

۱۵؎ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۲/ ۲۶-۲۷ نے بیس نفر یا اس کے قریب کا ذکر کیا ہے اور بعض دوسرے مآخذ میں ساٹھ کی تعداد بھی ہے۔

۱۶؎ حوالہ سابق؛ ابن کثیر، ۳/ ۷۱-۹۰؛ مکی اسوہ نبوی، ۱۳۱ وما بعد؛ ظہور احمد اظہر، ۱۶۲-۱۶۹، بہ حوالہ ابن ہشام، ابن کثیر، سیر اعلام النبلاء اور زرقانی وغیرہ۔ موصوف نے حسب معمول اس بحث میں بھی دوسرے امورِ سیرت اور واقعاتِ تاریخ سے بحث کی ہے، جو ان کے جوش ایمانی اور خروشِ ادب کی عکاس ہے۔

۱۷؎ ابن اسحاق/ ابن ہشام؛ ابن سعد، ۴/ ۱۷۳۔ ابوموسیٰ الاشعریؓ کے بارے میں صراحت کی ہے کہ وہ مکہ میں اسلام لائے، پھر ارضِ حبشہ کو ہجرت کی اور پھر دو کشتیوں والوں کے ساتھ خیبر میں خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوسری روایت میں وضاحت ہے کہ وہ مکہ میں اسلام لانے کے بعد اپنے وطن میں کام کرتے رہے، پھر وہاں سے حبشہ پہنچے۔ اشعریوں کی تعداد ۵۵ تھی؛ ۴/ ۷۷۳۔ ان کے ساتھ دوسی حضرات بھی تھے۔

۱۸؎ بدوی قبائل عرب میں مقامی مبلغین کرام اور داعیوں کے ہاتھ پر قبولِ اسلام کا ایک درخشاں سلسلہ ہے اور اس کے بعد چمکتے ستارے ہیں: حضرت ابوہریرہ دوسیؓ، حضرت عمرو بن طفیل دوسیؓ کے خاندان والے، حضرت اشج عبدالقیسیؓ اور ان کے برادر زادے۔ بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب خاک سار 'عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت'، طبع دہلی ۱۹۸۵ء کا باب دوم۔

۱۹؎ مجیب اللہ ندوی، اہل کتاب صحابہ وتابعین، مطبع معارف اعظم گڑھ، ص ۲ و مابعد اور حاشیہ: ۱-۲؛ مکی اسوۂ نبوی، حوالہ سابق۔

۲۰؎ ابن اسحاق/ ابن ہشام اور واقدی کی دو روایات بابت اسلام حضرات ثلاثہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے ایک نامہ گرامی کا ذکر ہے۔ ابن سعد (۴/ ۴۴۴) نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کے بہ دست دو نامے بھیجے گئے تھے، جن میں الگ الگ دو مضامین تھے۔ حضرت عمرو ضمریؓ جنگِ احد کے بعد فوراً اسلام لائے تھے۔ انھوں نے خلافت معاویہ میں وفات پائی۔

☆☆☆

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

۱۔مقام اشاعت: نبی نگر، (جمال پور) علی گڑھ

۲۔نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔قومیت: ہندوستانی

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۶۔ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی،

نبی نگر، (جمال پور) علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۲۔ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)

سی ۹، ڈوپلکس کوارٹرس، سول لائنس، علی گڑھ

۳۔ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)

شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۴۔ پروفیسر صدیق حسن (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۵۔جناب محمد جعفر (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۶۔مولانا محمد فاروق خاں (رکن)

۱۳۵۳۔بازار چتلی قبر، دہلی۔۶

۷۔جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)

مالاتھن کنڈی ہاؤس، بلیری، کالی کٹ

۸۔ جناب نصرت علی (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

۹۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)

طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی

۱۰۔انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)

حیدرآباد

۱۱۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (رکن)

اقرا کالونی، سرسید نگر، علی گڑھ

مندرجہ بالا معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر

سید جلال الدین عمری

شہریت کا مسئلہ۔ اسلامی نقطۂ نظر

مولانا اختر امام عادل قاسمی

شہریت کا مسئلہ عہد حاضر کے جدید ترین مسائل میں ہے، جس پر مختلف جہتوں سے کئی دہائیوں سے گفتگو ہورہی ہے۔ یہ مسئلہ انسان کی شناخت کا اولین ذریعہ بن گیا ہے۔ مذہب اور رنگ ونسل کی بنیادیں آج ثانوی درجہ میں چلی گئی ہیں۔ گویا یہ عہد کے لحاظ سے معیار کی تبدیلی ہے۔ پہلے انسان کی پہچان اس کے افکار وخیالات اور مذہبی تصورات سے ہوتی تھی، ان کے علاوہ رنگ ونسل اور زبان بھی امتیاز کا معیار بنتے تھے۔ لوگ جغرافیائی بنیادوں پر اتنا یقین نہیں رکھتے تھے اور نہ ان پابندیوں کے قائل تھے، بلکہ زمین کے ہر خطہ کو ہر فکر ونظر اور ہر رنگ ونسل کے لیے آزاد سمجھا جاتا تھا۔

یورپ میں جب مغربی اقوام کو غلبہ حاصل ہوا اور لادینی رجحانات کا فروغ ہوا تو ان کے اثرات یورپ کے زیرنگیں تمام علاقوں میں پہنچے، خواہ وہ ان کی قدیم آبادیاں ہوں یا نوآبادیات۔ اس کے نتیجے میں وطنیت کا نیا بُت تراشا گیا اور اس کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم کیا گیا، مذہب اور خون کے رشتوں کو کاٹا گیا، ایک علاقہ میں رہنے والے تمام لوگوں کو، خواہ وہ کسی رنگ ونسل کے ہوں اور کسی بھی فکر ونظر اور مذہب وملت کے حامل ہوں، ایک قوم قرار دیا گیا۔ اسی تصور کی بنیاد پر ملکوں کی سرحدی پابندیاں شروع ہوئیں، آمدورفت اور بود وباش کی سہولتیں محدود کی گئیں اور اس کے لیے نئے قواعد وضوابط وضع کیے گئے۔ یورپ کے عالمی قوت بن جانے کے بعد ان اصولوں کو بھی عالمی حیثیت دی گئی اور تمام ممالک کے لیے ان کی پابندی لازم کردی گئی۔

اس دور میں کچھ نئی اصطلاحات وضع کی گئیں، جن میں سے ایک شہریت کی

اصطلاح بھی ہے۔عربی میں اب اس کے لیے 'جنسیت' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جو قومیت (Nalionalily) کا مترادف ہے۔یعنی اب نئے معیار کے مطابق قوم مذہب یا رنگ ونسل سے نہیں، بلکہ وطن سے بنتی ہے،اس لیے اس کی جنس اسی ملک کی طرف منسوب ہوگی۔عالمی سیاست پر مغرب کی بالادستی سے قبل ان اصطلاحات کا وجود نہیں تھا۔پہلے اس کے لیے عربی زبان میں 'وطنیت' یا 'توطن' کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔اردو میں شہریت کی اصطلاح بڑی حد تک وطنیت سے قریب ہے،لیکن مفہوم میں بڑا فرق ہے۔اب شہریت کا استعمال 'جنسیت' کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔وطنیت کے لفظ میں بڑی وسعت ہے۔عارضی اقامت گاہوں کے لیے بھی وطن کا لفظ استعمال کیا جاسکتا تھا۔البتہ دونوں میں فرق کرنے کے لیے مستقل اقامت گاہوں کو 'وطن اصلی' یا 'وطن قرار' کہا جاتا تھا اور عارضی اقامت گاہوں کو وطن اقامت، وطن سکونت یا وطن مستعار کہا جاتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ جس معنیٰ میں آج شہریت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، وہ بڑی حد تک صرف 'وطن اصلی' یا 'وطن قرار' میں پایا جاتا ہے۔اس کی روشنی میں شہریت کے معنیٰ ومفہوم کو سمجھا جاسکتا ہے۔

شہریت کی اصطلاحی تعریف اور اقسام

شہریت موجودہ اصطلاح میں فرد اور حکومت کے درمیان اس مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس ریاست کی طرف منسوب ہوتا ہے جہاں کا وہ شہری ہے۔ مثلاً ہندوستانی، امریکی، برطانوی اور سعودی وغیرہ۔پھر شہریت کی بھی دو قسمیں ہیں : (۱) پیدائشی شہریت :یعنی کسی ملک میں پیدائش کی بنیاد پر بلا اختیار بچہ کو شہریت حاصل ہوجائے۔(۲) اختیاری شہریت: یعنی وہ شہریت جو سعی وارادہ سے حاصل کی جائے، مثلاً اس ملک کی کسی لڑکی یا لڑکے سے شادی کرلی جائے، یا حکومت سے درخواست کرکے شہریت حاصل کی جائے، وغیرہ۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل

ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے، مثلاً ہندوستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرلے تو اس کی ہندوستانی شہریت ختم ہوجائے گی۔ اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے، مثلاً پاکستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرے تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت برقرار رکھنے کا حق حاصل رہتا ہے۔ یہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے معاہدات کی روشنی میں طے پاتا ہے کہ کس ملک کے شہری کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا جائے؟

پھر جب کوئی شخص کسی ملک کا شہری بن جاتا ہے تو اس کو وہ تمام حقوق ومراعات حاصل ہوجاتے ہیں جو ایک پیدائشی شہری کو حاصل ہوتی ہیں اور وہ تمام ضمانتیں مل جاتی ہیں، جو بحیثیت شہری کے ملنی چاہئیں۔ اسی کے ساتھ اس پر بعض واجبات اور مطالبات بھی عائد ہوتے ہیں، جن کی تکمیل بہ حیثیت فرد اس کو کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ہر شہری کو ملنے والے حقوق درج ذیل ہیں:

- اسے اپنے ملک میں مستقل قیام کا حق حاصل ہے۔
- وہ ملک کے تمام وسائل سے بلا امتیاز استفادہ کرسکتا ہے۔
- وہ اپنی صلاحیت سے ملک کے کسی بھی عہدہ اور منصب تک پہنچ سکتا ہے، کوئی بھی ملازمت حاصل کرسکتا ہے، کسی بھی قسم کی تجارت کرسکتا ہے۔
- اسے اپنے ملک میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی۔
- اس کی جان ومال اور عزت ووقار کو تحفظ فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، وغیرہ۔

اسی طرح اس پر شہری کی حیثیت سے درج ذیل واجبات عائد ہوتے ہیں:

- ملکی آئین کے ساتھ اس کی وفاداری ضروری ہے۔
- وہ ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لے۔
- ملکی مفادات کے تحفظ کے لیے ہر طرح کی خدمت وقربانی کے لیے تیار رہے وغیرہ۔

شہریت کے اصول اور بنیادیں

اسلام میں شہریت کے اصول وضوابط کیا ہیں؟ اور اس کے لیے کن چیزوں کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟ قرآن وسنت میں اس ضمن میں کوئی تصریح نہیں ملتی اور نہ فقہاء کے یہاں کوئی صراحت موجود ہے۔ البتہ وطن کی تفصیلات کے ضمن میں بعض چیزوں کا تذکرہ ہوا ہے، جن سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے کے مباحث فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں موجود نہیں ہیں۔ فقہاء مالکیہ کے یہاں بھی یہ بحث اجمال کے ساتھ آئی ہے، البتہ فقہاء حنفیہ کے یہاں نسبتاً زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ اکثر علماء حنفیہ نے اس موضوع سے تعرض کیا ہے۔ ان تفصیلات سے زیر بحث مسئلے میں فی الجملہ تین بنیادیں ابھر کر آتی ہیں، جن کو شہریت کے مسئلے میں مدار بنایا جاسکتا ہے:

(۱) ولادت: یعنی وہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو۔

(۲) نکاح: یعنی وہاں کے کسی شخص سے زوجیت کا رشتہ قائم ہوا ہو۔

(۳) مستقل بود وباش کا ارادہ، خواہ ملازمت اور ذریعۂ معاش کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے۔

علامہ محمود بن مازہ بخاری شہیدؒ (م ۶۱۶ھ) لکھتے ہیں:

وطن أصلي وهو مولدالرجل والبلد الذی تأهّل به۔۱؎	کسی شخص کا وطن اصلی وہ ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو۔

علامہ کاسانیؒ رقم طراز ہیں:

أو بلدة اخریٰ اتخذها دارًا وتوطّن بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها۔۲؎	کسی شخص کا وطن وہ مقام بھی ہے جہاں پر اس نے اپنا گھر بنالیا ہو اور اہل وعیال کے ساتھ وہاں مستقل رہتا ہو اور وہاں سے کہیں اور جانے کا ارادہ نہ ہو۔

بعض فقہاء مالکیہ نے بھی ان میں سے کچھ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ محمد بن عبداللہ الخرشیؒ مختصر خلیل کی شرح میں لکھتے ہیں:

الأول الوطن وهو ما اتّخذ فيه الإقامة بنية التأبيد۳؎

وطن وہ ہے جہاں اس نے ہمیشہ کی نیت سے قیام کا ارادہ کرلیا ہو۔

والوطن في الثانية هو المسافر بقرية فيها أهلهٗ وولدهٗ فأقام عندهم ولو صلاة واحدة أتمّ ... ومن كتاب ابن المواز وإذالم تكن مسكنهٗ ولكنهٗ نكح بها فلايتمّ حتى يبنى بأهلهٖ ويلزمهٗ السكنىٰ۔ ۴؎

وطن سے مراد ایسی بستی کا سفر ہے جہاں اس کے اہل وعیال رہتے ہوں، وہاں ایک نماز کے برابر بھی قیام کرے گا تو اس پر اتمام ضروری ہے،.....اور اگر اس کا وہ مسکن نہ ہو، لیکن اس نے نکاح کیا ہو تو پوری نماز اس وقت پڑھے گا جب کہ اپنی بیوی کے ساتھ وہیں زفاف گزارے اور سکونت لازم ہے۔

فقہاء کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وطنیت کے حصول کے لیے یہ تینوں بنیادیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں، یعنی ان میں سے کوئی ایک بنیاد بھی موجود ہو تو شہریت حاصل ہوجائے گی۔ اسی لیے اگر کسی کو دو جداگانہ مقامات پر ان میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہو تو اسے دوہری شہریت حاصل ہوگی اور دونوں جگہیں اس کے لیے وطن کا درجہ رکھیں گی۔ المحیط البرہانی میں ہے:

وان كان لهٗ أهل ببلدةٍ فاستحدث ببلدةٍ أخرىٰ أهلاً فكل واحدٍمنهما وطن أصلي،وروى انهٗ كان لعثمان رضی اللہ عنہ أهل بمكة وأهل بالمدينة وكان يتمّ الصلوٰة بهما جميعاً۔ ۵؎

اگر کسی کے اہل وعیال ایک شہر میں ہوں، پھر دوسرے شہر میں اس نے شادی کرلی تو دونوں شہروں کی شہریت اسے حاصل ہوگی۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ایک بیوی مکہ معظّمہ میں رہتی تھیں اور دوسری مدینہ منورہ میں چنانچہ وہ دونوں جگہ نماز پوری پڑھتے تھے۔

اسی طرح فقہاء نے مستامن کی بحث میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم دارالاسلام میں وقتی قیام کی غرض سے داخل ہو، لیکن پھر مستقل قیام کا ارادہ کرلے، یا (علیٰ اختلاف الاقوال) طویل مدت تک قیام کرے، یا وہاں کے کسی متوطن سے رشتۂ ازدواج

قائم کرلے ، یا وہاں کی کوئی خراجی زمین خرید لے تو اسے دارالاسلام کی شہریت حاصل ہوجائے گی اور وہ مستامن باقی نہیں رہے گا ، نیز اگر وہ اہل وعیال کے ساتھ ہے تو اس کے ساتھ وہ بھی اہل ذمہ (یعنی اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری) قرار پائیں گے۔٦ ؎

یہ بات اگرچہ غیر مسلموں کے تعلق سے کہی گئی ہے، مگر فی الجملہ اس کو شہریت کے حصول کے معاملے میں بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

شہریت کے نئے قواعد بنائے جاسکتے ہیں

فقہاء نے مذکورہ جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، وہ بہ ظاہر حصر کے لیے نہیں ہیں، بلکہ یہ اس دور کی چند معروف صورتوں کا تذکرہ ہے، کیوں کہ یہ چیزیں منصوص نہیں، بلکہ اجتہادی ہیں، جن میں عرف وعادت اور مشاہدہ وتجربہ کا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی ملک کا قانون شہریت کے لیے کچھ نئی بنیادیں وضع کرے ، یا مذکورہ چیزوں میں ترمیم کرے یا کچھ شرطوں کا اضافہ کرے تو اس کی گنجائش محسوس ہوتی ہے، بشرطے کہ اس کا مقصد ملک وملت کی سلامتی اور شہریوں کا تحفظ ہو، اس لیے کہ عرف وعادت میں تغیر ممکن ہے اور ملکی قانون میں تبدیلی تغیرِ عرف کی علامت قرار دی جائے گی۔

مسلم ملک میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کا مسئلہ

اس ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا کسی مسلم ملک کے لیے ہر ایسی درخواست شہریت کی تعمیل ضروری ہے جو کسی دوسرے ملک کے مسلم امیدوار کی جانب سے پیش کی جائے ؟

اس معاملہ میں اسلام کا اصل مزاج، جو قرآن وحدیث کی نصوص سے سمجھ میں آتا ہے، یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کو ایسے تمام مسلم امیدواروں کے لیے توسع کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ کئی نصوص سے اس پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ قَالُوْٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ (النسائ:۹۷)

بے شک ان لوگوں کی جان، جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے، (جب) فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے؟ وہ بولیں گے: ہم اس ملک میں بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے: اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟

اس آیتِ کریمہ میں جہاں ایسی سرزمین میں اقامت کو جرم قرار دیا گیا ہے جہاں نظامِ طاغوت کی حکم رانی ہو، وہیں اسلامی حکومتوں کو یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ اللہ کی زمین اللہ کے نام پر آنے والوں کے لیے تنگ نہیں کی جانی چاہئے، بلکہ مہاجرین کے لیے وہاں ہمیشہ گنجائش رہنی چاہئے، اس لیے کہ ہجرت کے حکم سے قبل مقامِ ہجرت کا وجود شرط ہے۔ اس کے بغیر حکمِ ہجرت کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی۔ مہاجرین کے لیے حالات کے تحت حکم میں فرق ہوسکتا ہے، مگر ایک خالص اسلامی ریاست کو اس حکم کی تعمیل میں ہر وقت لچک رکھنی ہوگی۔

اسی طرح قرآن کریم میں ہجرت کر کے مدینہ آنے والی خواتین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا إِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ۔ (الممتحنۃ:۱۰)

اے ایمان والو! تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا جائزہ لو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جانتا ہے اگر وہ تمہیں مومن معلوم ہوں تو ان کو کافروں کے پاس مت لوٹاؤ۔

دراصل یہ حکم ایک خاص پس منظر میں دیا گیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہل مکہ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رُو سے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے مسلمانوں کو مدینہ کی سکونت نہیں دی جاسکتی تھی، بلکہ ان کو مکہ واپس کرنا ضروری تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینہ سے مکہ چلا جاتا، تو اہل مکہ پر ان کو لوٹانا ضروری نہیں تھا۔

یہ معاہدہ اگرچہ مردوں اور عورتوں سب کے لیے بہ ظاہر یکساں تھا، لیکن عملاً عورتوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوا، چنانچہ اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والی خواتین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس نہیں فرمایا۔

مہاجرین کے مسئلہ پر مسلم ملک کا غیر مسلم ملکوں سے معاہدہ

البتہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کرلے، یا اس قسم کے کسی بین الاقوامی منشور کو منظوری دے، جس کی رؤ سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہو تو اس صورت میں حکم شرعی کیا ہوگا؟

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

مالکیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں معاہدہ پر عمل کرتے ہوئے مہاجرین سے شہریت کے معاملے میں معذرت کا جواز ہے، البتہ اسلامی حمیت کے نقطۂ نظر سے خارجی طور پر ان کی مدد کی جائے گی۔[۷]

ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلام میں معاہدوں کی پابندی کی بڑی اہمیت ہے، خواہ وہ مسلمانوں سے کیے جائیں یا غیر مسلموں سے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَأَوْفُواْ بِعَهْدِ اللّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلاَ تَنقُضُواْ الأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلاً إِنَّ اللّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ (النحل:۹۱)

جب معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو، اور قسمیں موکد کرنے کے بعد نہ توڑو، جب کہ تم نے اللہ کو اپنے اوپر کفیل بنالیا ہے۔ جو تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔

ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابوطفیلؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میری شرکت اس لیے نہیں ہوسکی تھی کہ میں اور میرے والد حسیل مکہ سے نکلے تو کفارِ قریش نے ہمیں پکڑ لیا کہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ ہم نے کہا: نہیں، ہم صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں تو ان لوگوں

نے ہم سے اللہ کے نام پر ہم سے عہد و پیمان لیا کہ ہم سیدھے مدینہ جائیں اور آپؐ کے ساتھ جنگ میں شرکت نہ کریں۔ لیکن ہم سیدھے رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، (آپ بدر میں تھے) اور سارا ماجرا سنایا۔ آپؐ نے فرمایا:

انصرفا، نفی لھم بعھدھم و نستعین اللہ علیھم ۸؎	تم دونوں مدینہ واپس جاؤ، ہم ان کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ان کے خلاف مدد چاہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد جو طرز عمل اختیار فرمایا اس سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ آپؐ نے اس وقت کے حالات کے مطابق یک طرفہ طور پر کفار کی شرطوں کو قبول فرمایا، جن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کے شہر کا کوئی مسلمان ان کی مرضی کے بغیر دارالکفر (مکہ) سے نکل کر دارالاسلام (مدینہ) نہیں جا سکتا۔ آج بھی ویسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس کو قانون کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

شافعیہ اس طرف گئے ہیں کہ اس طرح کی شرطوں کو قبول کرنا درست نہیں اور نہ آنے والے مسلمانوں کو واپس کرنا جائز ہے، البتہ اگر ان کے اہل خاندان اپنے ملک میں مضبوط اور صاحب اثر و رسوخ ہوں اور انہیں خاندانی حمایت حاصل ہو، جس سے ان کی ابتلا کا اندیشہ کم ہو تو واپس کرنے کی گنجائش ہے۔ بعض شوافع کا خیال ہے کہ جس مسلمان پر ہجرت فرض نہ ہو اس کو واپس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ آزاد شخص کو واپس کرنے کی اجازت ہے، کہ اس صورت میں وہ واپس جانے کے بہ جائے کہیں اور اپنی پناہ گاہ تلاش کر سکتا ہے، جس طرح کہ صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوبصیرؓ نے کیا تھا، جب اللہ کے رسولؐ نے ان کو واپس کر دیا تھا۔ ۹؎

حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ شرط باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ ۱۰؎

اس کی کئی وجوہ ہیں:

(الف) صلح حدیبیہ کا واقعہ دائمی نہیں، وقتی تھا۔ بعد میں اس کو منسوخ کر دیا گیا۔قرآن کریم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے:

فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنۃ: ۱۰)	ان (عورتوں) کے ایمان کا علم ہو جانے کے بعد ان کو کافروں کے پاس واپس نہ بھیجو۔

یہ اس تاویل پر مبنی ہے کہ معاہدہ کو مردوں اور عورتوں کے لیے عام قرار دیا جائے، جیسا کہ مشہور ہے۔ ۱۱؎

(ب) یہ حکم نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص تھا، اس لیے کہ آپ صاحبِ وحی تھے۔ آپ وحی کے ذریعہ معلوم کر سکتے تھے کہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں؟ جیسا کہ حدیبیہ کے بہ ظاہر مغلوبانہ معاہدہ کو قرآن کریم نے فتح مبین قرار دیا۔ یہ ظاہری صورت کے اعتبار سے نہیں، بلکہ نتائج کے اعتبار سے تھا۔عہدِ نبوت کے بعد اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ واقعات کے نتائج کا پہلے سے علم ہو، اس لیے اب اس کی اجازت نہیں ہوسکتی کہ مسلمان کفر کے مقابلے میں مغلوبانہ پوزیشن اختیار کریں اور حقارت آمیز شرطوں پر معاہدے کریں۔ ۱۲؎

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ نے اس طرح کی شرطوں کا انکار دو وجہوں سے کیا ہے: ایک ذلت وحقارت اور دوسرے مسلمان ہونے کی بنا پر ابتلاء وآزمائش۔لیکن اگر معاہدہ دوطرفہ مساوات پر مبنی ہو اور دارالکفر میں مسلمانوں کے ابتلاء و آزمائش کا اندیشہ نہ ہو، جیسا کہ آج کے دور میں ہے، تو حنفیہ اپنے اس حکم پر اصرار نہیں کریں گے۔ لیکن بعض مراجع سے اندازہ ہوتا ہے کہ واپسی کے معاہدہ پر برابری کی صورت میں بھی وہ راضی نہیں ہیں اور اس شق کو وہ صریح طور پر معاہدہ نامہ سے خارج کیے جانے کے قائل ہیں ،یعنی معاہد ملکوں کو صراحت کے ساتھ بتا دیا جائے گا کہ ہم اپنے ملکوں میں ہجرت کرکے آنے والے مسلمانوں کو واپس نہیں کریں گے۔شرح السیر الکبیر میں ہے:

وھذا شرط لاینبغی أن یترک ذکرہٗ فی الکتاب لانہٗ اذا أخرج إلینامنھم	معاہدہ نامہ میں اس شرط کا ذکر نہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی مسلمان

مسلم أوذمی لایجوز لنا أن نردّہٗ علیھم فالظاھر أنھم یطالبوننا بالمناصفة ویقولون: کما لاتردّون أنتم فنحن لانرد، وبعد ذکر ھذا الشرط تنقطع ھذہ المحاجة۔ ۱۳؎

یا ذمی ان کے پاس سے نکل کر ہمارے پاس چلا آئے تو ہمارے لیے ان کو واپس کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ برابری کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے کہ جیسے تم ہمارے آدمی کو نہیں لوٹاتے ہو، ہم بھی نہیں لوٹائیں گے، لیکن صراحتاً اس شرط کے تحریر میں آجانے کے بعد حجت باقی نہیں رہے گی۔

موجودہ دور میں عالمی حالات کافی بدل چکے ہیں۔ سیاسی طور پر مسلمانوں کی وہ پہلی سی شان بھی باقی نہیں رہی اور مسئلہ اختلافی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی شرط کا قبول کرنا قطعی طور پر ثابت ہے، البتہ اس کے نسخ کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ اس لیے پیش نظر مسئلہ کو منسوخ ماننے کے بجائے اختلافِ احوال پر محمول کیا سکتا ہے، یعنی عہدِ غلبہ اور عہدِ مغلوبیت کے احکام میں فرق کرنا ہوگا۔ حدیبیہ کا واقعہ اس دور کا ہے جب عرب کی سطح پر مسلمان عہدِ غلبہ میں داخل نہیں ہوئے تھے، ان کا عہدِ غلبہ صحیح معنیٰ میں فتح مکہ کے بعد شروع ہوا۔

مسلم ملک میں مسلمان پناہ گزینوں کا مسئلہ

بعض دفعہ کسی ملک کے مسلمان مجبور ہوکر کسی مسلم ملک سے سیاسی پناہ کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ مسلم ملک ان کو سیاسی پناہ دینے پر آمادہ ہوتا ہے، لیکن ان مسلمانوں کو پناہ گزیں کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے، انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کیا اس کی شرعاً گنجائش ہے؟

اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(الف) سیاسی پناہ کے لیے کسی ملک میں اقامت اختیار کرنا عموماً ایک وقتی عمل ہوتا ہے، یعنی اگر پناہ گزیں کے اپنے ملک کے حالات درست ہو گئے تو واپس چلا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ شہریت کے حصول کے لیے مستقل قیام کا ارادہ ضروری ہے، اس

لیے اگر اس بنیاد پر ملک کے عام شہری اور سیاسی پناہ گزینوں میں فرق کیا جاتا ہے تو شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ عارضی قیام کرنے والوں کو اس ملک کے اصل باشندوں کا درجہ نہ دیا جائے تو یہ ایک انتظامی عمل ہے اور شریعت میں اس پر کوئی نکیر موجود نہیں ہے۔ اس طرح کے فرق کا ثبوت خود عہدِ نبوت میں ملتا ہے۔ مثلاً مختلف وفود وقتی تعلیم وتربیت کے لیے مدینہ منورہ آتے تھے اور کچھ دن قیام کرکے واپس چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حقوق وواجبات کے معاملے میں ان کو اہل مدینہ کا مقام حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح بہت سے وہ لوگ، جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فإن أبوا أن يتحوّلوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين، يجرى عليهم حكم الله الذى يجرى على المؤمنين، ولا يكون لهم فى الغنيمة والفيء شيء إلا أن يجاهدوا مع المسلمين۔ ۱۴

اگر یہ لوگ دارالہجرۃ میں واپس ہونے پر رضامند نہ ہوں تو ان کو خبردار کردو کہ وہ اعرابی مسلمانوں کے درجے میں ہوں گے اور وہ حکم الٰہی کے اسی طرح پابند ہوں گے جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں، مگر ان کو مال غنیمت اور فئے میں کوئی حصہ نہیں ملے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں۔

نیز اسلام کا یہ متفقہ اصول ہے کہ:

المغنم بالمغرم فى الاسلام۔ ۱۵

نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

جو لوگ ملک کے مستقل شہری ہیں ان پر ملک کی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، مثلاً ان کو خزانۂ مال کے استحکام کے لیے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، ملک کے تحفظ کے لیے جان ومال کی قربانی دینی پڑتی ہے وغیرہ، اس لیے بہت سے اضافی حقوق بھی انہی کو مل سکتے ہیں، جو محض سیاسی پناہ کے لیے مقیم حضرات کو نہیں مل سکتے۔

(ب) البتہ اگر سیاسی پناہ حاصل کرنے والے کا قیام وقتی نہ ہو، بلکہ وہ مستقل طور پر اس ملک میں آباد ہوجانے کا ارادہ رکھتا ہو اور سیاسی پناہ کی درخواست محض اس ملک میں داخلہ کا عنوان ہو تو ایسے لوگوں کو مستقل شہریوں کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ ان

کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنا درست نہ ہوگا۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد اس سلسلے میں بہت واضح ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجٰهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آوَواْ وَّنَصَرُواْ أُوْلٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (الانفال: ۷۲)

جولوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کے لیے اپنی جانی اور مالی صلاحیتیں خرچ کیں اور وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دارالاسلام منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کو وہاں کے مقیم مسلمانوں کے مساوی قرار دیا اور ان کو باہم بھائی بھائی بنادیا۔ اسلام میں جغرافیہ اور رنگ ونسل کوئی چیز نہیں ہے، یہ صرف باہم تعارف کے ذرائع ہیں۔ اصل پہچان رشتۂ ایمان ہے۔ اگر کوئی چیز اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس کو ختم کرکے صرف کلمہ کو پہچان کی بنیاد بنائی جائے گی اور کلمہ میں شریک تمام لوگ بھائی بھائی قرار دیے جائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

من صلّیٰ صلاتنا و استقبل قبلتنا و أکل ذبیحتنا فهو المسلم، له ما للمسلم، وعلیه ماعلی المسلم۔ ۱۶

جوشخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کا رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مسلمان ہے اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور اس پر وہ تمام واجبات عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔

اس کی تائید اس مسئلۂ شرعی سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی مستامن (وقتی امان لے کر آنے والا غیر مسلم) یا ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم شہری) اسلام قبول کرلے تو بہ اتفاق فقہاء اس کا عقد ذمہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ تمام امتیازات بھی کالعدم ہوجاتے ہیں جو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جملہ حقوق وواجبات میں وہ وہاں کے مسلم شہریوں کے مساوی قرار پاتا ہے۔ ۱۷

البتہ شہریت کی تکمیل کے لیے انتظامی طور پر کچھ قواعد وضوابط وضع کیے جاسکتے

ہیں اور اس کے لیے کوئی مدت یا مراحل مقرر کیے جاسکتے ہیں۔

شہریت سے وابستہ حقوق وواجبات

رہا یہ مسئلہ کہ شہریت کی بنیاد پر کیا کیا حقوق وواجبات عائد ہوتے ہیں؟ یعنی وہ کیا چیزیں ہیں جو بہ طور حق شہریوں کو ملتی ہیں اور بہ طور ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے؟ تو میرے علم ومطالعہ کی حد تک اسلام میں اس کی کوئی تفصیل مقرر نہیں ہے۔ کچھ حقوق بنیادی ہیں اور کچھ احوال وظروف اور زمان ومکان کے تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں ،اس لیے ان کی تفصیلات کی تعیین ممکن نہیں۔ جوحقوق وواجبات وہاں کے عرف میں شہریت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں،شریعت ان کی نفی نہیں کرتی۔گزشتہ صفحات میں ایک روایت کا حوالہ دیا گیاہے،اس میں عمومیت کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں:

لہٗ ماللمسلم ، وعلیہ ماعلی المسلم۱۸؎

وہ تمام حقوق جو مسلمانوں کو ملتے ہیں وہ اس کو ملیں گے اور وہ تمام واجبات جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں اس پر عائد ہوں گے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو میثاق تیار فرمایا اس میں بلا امتیاز مذہب وملت داخلی اور خارجی سطح پر جن حقوق وواجبات کی نشان دہی کی گئی تھی،ان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حقوق کے باب میں کوئی خاص شکل مقرر نہیں ہے ،بلکہ ان کا تعلق مختلف ملکوں کے اپنے حالات، تقاضوں اور عرف سے ہے۔ اس معاملے میں ہر ملک کی انتظامیہ پوری طرح آزاد ہے کہ کس چیز کو وہ حق قرار دیتی ہے اور کس چیز کو واجبات میں شامل کرتی ہے؟ بس شرط یہ ہے کہ اس تعین کی بنیاد معروف پر ہو،انسانیت کی فلاح پیش نظر ہو،اسلام کی روح اور مقاصد سے ہم آہنگی ہو اور شریعت کی کسی نص سے تصادم نہ ہو۔

مسلمانوں کے لیے غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کرنا

اگر کوئی مسلمان ضرورت ومجبوری کی بناپر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے کسی

غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟

ہمارے قدیم مراجع میں یہ بحث باضابطہ نہیں ملتی، لیکن عصر حاضر میں یہ مسئلہ علماء کے درمیان زیر بحث رہا ہے۔۱۹؎ راقم الحروف کی کتاب 'غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

اس سلسلے میں علماء کے دو نقطۂ نظر سامنے آتے ہیں:

(۱) ایک نقطۂ نظر اس کے ناجائز ہونے کا ہے۔ اس کے قائلین کے دو طبقات ہیں:

(الف) ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور جو لوگ غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں ان پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کا قائل ہے۔ اس طبقہ کے مشہور علماء یہ ہیں: شیخ محمد رشید رضا مصری، ۲۰؎ شیخ محمد یوسف الدجوی، شیخ محمد شاکر، (یہ ازہر کے اکابر اہل علم میں سے ہیں) شیخ ادریس شریف محفوظؒ۔ (یہ اپنے وقت میں بیروت کے مفتی تھے) ۲۱؎ اور ڈاکٹر محمد عبدالکریم الجزائری ۲۲؎ وغیرہ۔

(ب) دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے۔ اس طبقہ میں شیخ مختار السلامی، رکن مجمع الفقہ الاسلامی اور شیخ محمد عبداللہ بن سبیّل امام وخطیب مسجد حرام وعضو ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ۲۳؎ اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء نے بھی یہی فتویٰ جاری کیا ہے۔ ۲۴؎

(۲) دوسری رائے جواز کی ہے، پھر جواز کے قائلین کے بھی دو نقطۂ نظر ہیں:

(الف) ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بہ وقت ضرورت ہے۔ عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی، مفتیٔ عام سلطنت عمان ورکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے۔ مصری دارالافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ ۲۵؎

(ب) دوسرا نقطۂ نظر اصلاً جواز کا ہے، البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہوسکتا ہے۔

عہد حاضر کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے۔ اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہ ہیں: ڈاکٹر یوسف القرضاویؒ ۲۶؎، ڈاکٹر محمد رافت عثمانی، عمید الکلیۃ الشرعیۃ والقانون،

جامعۃ الازہر، ڈاکٹر وہبہ الزحیلیؒ ۲۷؎ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ۲۸؎ وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل

جو حضرات عدمِ جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيْدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوٓاْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓاْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيْداً (النساء:۶۰)

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی، جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل ہو چکی ہے، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالاں کہ انہیں حکم مل چکا ہے کہ اس کے مقابلے میں کفر اختیار کریں اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے۔

طاغوت سے مراد وہ نظامِ قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔ غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا گویا بہ اختیار خود اسلامی نظامِ قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف کے مترادف ہے۔ ۲۹؎

(۲) ایک مقام پر قرآن نے مومن اور غیر مومن کے درمیان امتیاز کا معیار یہ بیان کیا ہے:

فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيْماً (النساء:۶۵)

پس آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے، جب تک کہ اس جھگڑے میں، جو ان کے آپس میں ہوں، آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کریں۔

اس آیت کریمہ کے تحت ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ ’’اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی امر کو رد کردے، وہ خارج از اسلام ہے، خواہ شک کی بنیاد پر رد کرے یا اس کو بالقصد قبول کرنے سے انکار کردے۔‘‘ ۳۰؎ غیر اسلامی مملکت میں قیام دوسرے الفاظ میں احکام الٰہی کو قبول کرنے سے بالارادہ گریز ہے۔

(۳) ان حضرات نے بعض ان احادیث سے بھی استدلال کیا ہے، جن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت وسکونت سے منع کیا ہے اور ایسے مسلمانوں سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان رہائش پذیر ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین ۳۱؎ — میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہو۔

(۴) ان حضرات نے عقلی طور پر استدلال کیا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام کا مطلب ان ملکوں کے تمام قانونی تقاضوں کی تکمیل ہے، جن میں بہت سی چیزیں خلافِ شرع بھی ہوسکتی ہیں۔ کبھی وہ ملک اپنے شہریوں سے فوجی خدمات کا بھی مطالبہ کرسکتے ہیں اور فوجی ملازمت کے دوران اگر خدانخواستہ کسی اسلامی سلطنت سے جنگ چھڑ جائے تو مسلم فوجیوں کو غیر مسلم فوجیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لینا ہوگا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض ایسی صورتیں پیش آسکتی ہیں جن میں خلافِ شرع باتوں پر عمل کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ جان بوجھ کر دینی طور پر اپنے کو ان شدید خطرات میں مبتلا کرے اور اپنی ہلاکت کا سامان کرے۔

جمہور کے دلائل

لیکن جو علماء جواز کے قائل ہیں، ان کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے۔ (مثلاً: التوبۃ: ۲۳،

الانبیائ: ۱۰۷، سبا: ۲۸، النحل: ۱۲۵، یوسف: ۱۰۸ وغیرہ) ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطہ میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر مسلم ملکوں میں بھی جائیں اور اسلام کی دعوت چار دانگ عالم میں پہنچائیں۔ اگر وہ اپنے ہی ملکوں میں سمٹ کر رہ جائیں تو اسلام کی دعوت اور اس کے نمونے غیر اسلامی دنیا تک کیسے پہنچیں گے؟ صحابۂ کرام نے دنیا کے سامنے جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا، وہاں قیام کیا اور اسلام کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔ انہوں نے دعوت وتبلیغ کے باب میں جغرافیائی امتیاز نہیں رکھا اور زمین کے کسی حصہ کو صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا کہ وہاں غیر اسلامی حکومت قائم ہے۔ اگر صحابہ اپنے آپ کو اسلامی ملکوں تک محدود کر لیتے تو ان کے ذریعہ عالمی دعوت کا وہ کام انجام نہ پاتا جو ان کا امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

قواعدِ فقہ سے رہ نمائی

اس سلسلے میں بعض قواعد فقہیہ سے بھی رہ نمائی ملتی ہے:

(۱) مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے: **لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان۔** ۳۲

جس دور میں بعض عرب علماء نے غیر مسلم ملک کی شہریت کو حرام قرار دیا تھا وہ فرانسیسی استعمار کا دور تھا۔ عرب ممالک بالخصوص تیونس اور الجزائر اس کے زیادہ شکار تھے۔ اس استعمار کا مقصد اسلام کے خلاف منصوبے بنانا، اس کی بنیادوں کو کم زور کرنا، اس کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا، سچے مسلمانوں پر ظلم وجبر کرنا اور دینی انحراف پھیلانا تھا۔ اس دور میں ظاہر ہے کہ اسلام دشمنوں کے ملکوں میں رہنا اور وہاں کا شہری بننا ایک خطرناک عمل تھا، جو عام مسلمانوں کے لیے نا قابلِ جواز تھا۔ لیکن آج حالات بدل چکے ہیں۔ مذہبی آزادی کا اصول بین الاقوامی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس لیے آج

اس قدیم فتویٰ پر (جو عبوری دور میں دیا گیا تھا) اصرار کرنا مناسب نہیں ہے۔ آج ضرورت ہے کہ حالات کے تغیر کے مطابق فتویٰ میں بھی تبدیلی لائی جائے۔

(۲) مصالح ومفاسد کے درمیان تعارض ہوجائے تو موازنہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے اور جو پہلو غالب ہو اس کے مطابق حکم شرعی عائد کیا جاتا ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے:

إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفّهما ۳۳؎	جب دو مفسدوں میں تعارض ہوجائے تو بڑی مضرت سے بچنے کی خاطر ہلکے مفسدہ کی اجازت دی جائے گی۔
الأخذ بأعظم المصلحتين ودفع أعظم المفسدتين ۳۴؎	دو مصلحتوں میں سے بڑی مصلحت کو اختیار کیا جائے گا اور دو مفسدوں میں سے بڑے مفسدہ کو دور کیا جائے گا۔

آج کے دور میں کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت میں کچھ نقصانات ضرور متوقع ہیں، لیکن ان کی تلافی کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ وہاں دینی ادارے قائم کیے جائیں، مدارس ومکاتب بنائے جائیں، مساجد کی تعمیر ہو، علماء ودعاۃ سے رابطہ رکھا جائے تو بڑی حد تک جوارِ کفر کی مضرتوں سے بچا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مصلحتیں ہیں، جو مسلمانوں کے وہاں قیام کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہیں مثلاً:

(الف) غیر مسلم ممالک اپنے شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی، فکر وخیال کی آزادی، اظہار رائے کی آزادی اور سیاسی، اقتصادی اور فوجی حقوق دیتے ہیں، جن کے تحت کوئی بھی شخص باعزت زندگی گذار سکتا ہے اور اپنے آئینی حقوق کے ذریعہ وہاں کی حکومت پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔

آج غیر مسلم طاقتیں بالخصوص مغربی ممالک جس طرح اسلام اور مسلم ممالک کے خلاف محاذ آرا ہیں یا اس کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد وہاں موجود ہو تو ان کے اس قسم کے فیصلوں پر بہ آسانی اثر انداز ہوسکتے ہیں اور خود حکومتوں کو

بھی مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے فیصلوں میں دس بار سوچنا ہوگا کہ اس کے نتائج خود ان ملکوں میں کیا ظاہر ہوں گے؟ اگر مسلمان وہاں نہ ہوں تو یہ بڑا قومی فائدہ اسلام اور ملت اسلامیہ کو حاصل نہیں ہوسکتا۔

(ب) غیر اسلامی ملکوں میں رہ کر مسلمان اپنے وسائل سے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں اور جو علماء، دعاۃ اور مسلمان وہاں پہنچیں ان کے لیے بہتر معاون ومددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ان ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں میں مسلمان نہ ہوں تو مسلم اقلیتوں کو وہاں کے وسائل سے استفادہ کی صورت کیا ہوگی؟

(۳) فقہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے:

مالایتم الواجب إلابہ فھو واجب۳۵؎	جس کے بغیر واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہے۔

دعوت الیٰ اللہ اس امت کا منصبی فریضہ ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ روئے زمین کے تمام باشندوں تک اسلام کی آواز نہ پہنچ جائے اور اس کے عملی نمونے ان کے سامنے نہ آ جائیں۔ آج کے دور میں اسلام کی آواز ترقی یافتہ وسائل ابلاغ کے ذریعہ پہنچائی جا سکتی ہے اور انھیں اسلامی تعلیمات سے بھی کسی حد تک روشناس کرایا جا سکتا ہے لیکن عملی نمونے کے لیے مسلمانوں کے ایک طبقہ کا وجود وہاں ضروری ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان اسلامی آئیڈیل کا کام دے۔ علاوہ ازیں یہ مسلمان خود بھی اپنے قول وعمل اور اخلاق وکردار سے امتِ غیر مسلمہ میں دعوت کا کام کریں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کریں اور وہاں کا حصہ بن جائیں، کیوں کہ غیر ملکیوں کا قول وعمل آج کی دنیا میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

(۴) فقہ کا ایک اور مشہور قاعدہ ہے:

الضرورات تبیح المحظورات۳۶؎	ضرورت کی بنیاد پر بعض ممنوعات کی اجازت دی جاتی ہے۔

کبھی مسلمانوں کو اپنے ملک کے بعض مسائل کی بنیاد پر ہجرت کی ضرورت

پیش آتی ہے اور موجودہ حالات میں پوری دنیا میں کوئی ایسی اسلامی مملکت نہیں ہے جو پوری وسعت نظری کے ساتھ کسی بیرونی مسلمان کو بہ حیثیت شہری قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، جب کہ بہت سے غیر مسلم ملکوں میں شہریت کے معاملے میں زیادہ توسّع موجود ہے۔ ان حالات میں بدرجۂ مجبوری مسلمانوں کو غیر مسلم ملکوں میں قیام وشہریت کی اجازت دی جانی چاہئے اور غیر مسلم ملکوں کے توسّع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

راجح مسلک

اس مسئلے پر عدمِ جواز کے قائلین اور مجوّزین کے دلائل کا جائزہ لینے پر موخرالذکر کا مسلک زیادہ مضبوط، قابل قبول اور لائق ترجیح محسوس ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) تمام علماء (خواہ وہ جواز کی رائے رکھتے ہوں یا عدم جواز کی) اس بات پر متفق ہیں کہ غیر مسلموں سے تعلقِ خاطر اور مسلم ملکوں کے مقابلے میں غیر مسلم ملکوں کی عظمت واحترام کے جذبہ سے ان کی شہریت حاصل کرنا ناجائز ہے۔ عدمِ جواز کے وہ تمام دلائل جو مانعین پیش کرتے ہیں، ان کی بہ آسانی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ ان کے درمیان یہی قدرِ مشترک ہے۔

(۲) اگر عدمِ جواز کی رائے علی الاطلاق مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا، جب غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحبِ ایمان کا داخلہ مشکل سمجھا جاتا تھا اور اس کو ارتداد یا تعاون علی الکفر کے مترادف تصور کیا جاتا تھا۔ آج وہ صورتِ حال باقی نہیں رہی۔ اب مسلمانوں کی بڑی تعداد وہاں مقیم ہے اور بڑے سکون اور آزادی کے ساتھ دینی زندگی گذار رہی ہے۔ وہاں بڑے بڑے دینی مراکز قائم ہیں۔ اسلام کی اشاعت کا کام بھی ہورہا ہے اور مسلمان اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد اور ان کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کرتے ہیں۔ ان مسلمانوں نے اپنی تمام تر توقعات اور صلاحیتیں اسی سرزمین کے لیے مرکوز کردی ہیں اور دوبارہ وطن واپسی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ان

حالات میں عدمِ جواز کی رائے یقیناً بعد از وقت اور دشوار کن ہے۔

(۳) عدمِ جواز کے قائلین نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ اپنے مفہوم ومصداق کے اعتبار سے قطعی نہیں ہیں، بلکہ ان میں تاویل کا احتمال موجود ہے۔ مثلاً:

(الف) جن آیات کریمہ کو اس استدلال میں پیش کیا گیا ہے کہ غیر مسلم ملک کی شہریت احکام اسلامی کا بالا رادہ ترک اور کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا اظہار ہے، اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں کے جو قوانین اسلامی احکام سے متصادم ہیں، ضروری نہیں کہ مسلمان ان کو من وعن قبول کرلیں، بلکہ ان کو حق ہے (اور ان کو یہ کرنا چاہئے) کہ وہ ان قوانین کے بارے میں اپنے مشترکہ احساسات ایوانِ حکومت تک پہنچائیں، ان کو تبدیل یا ان میں مناسب ترمیم کرانے کی متحدہ جدوجہد کریں اور جب یہ ترمیم منظور ہوجائے تو قانون کی اس لچک سے فائدہ اٹھائیں، مثلاً مرنے کے بعد مورث کے ترکہ کا قانون یوروپی ملکوں میں غیر اسلامی ہے، لیکن اس میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی فرد مرنے سے پہلے اپنے ورثہ کی تقسیم کے لیے کوئی لائحہ عمل تجویز کردے تو اس کی موت کے بعد ورثہ پر لازم ہوگا کہ وہ اس کے تجویز کردہ طریقۂ کار کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں۔ قانون کی اس شق سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہئے کہ مرنے سے قبل یہ وصیت تحریر کرجائیں کہ ان کی موت کے بعد ان کے ترکہ کی تقسیم اسلامی شریعت کے مطابق ہوگی۔ اس طرح ورثاء پر قانونی طور پر لازم ہوجائے گا کہ وہ شریعت کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں۔ اسی طرح ان ملکوں میں نکاح کا رجسٹریشن قانونی طور پر لازم ہے۔ اس کے بغیر نکاح غیر قانونی اور غیر نافذالعمل قرار پاتا ہے۔ اس صورت میں کسی قسم کے مطالبات بھی ثابت نہیں ہوتے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان اسلامی طور پر نکاح کرے اور اس کا رجسٹریشن بھی کرائے تو یہ قانونی طور پر ممنوع نہیں ہے۔ اس طرح ان غیر مسلم ملکوں میں پائی جانے والی قانونی مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے۔ وہاں کی شہریت حاصل کرنے سے ہرگز لازم نہیں آتا کہ اس شخص نے اپنے دین وایمان کا سودا بھی کرلیا ہے، العیاذ باللہ۔

(ب) بہت سے غیر مسلم ملکوں میں مسلم ممالک کو یہ قانونی اختیار دیا گیا ہے کہ وہاں کا کوئی شخص اگر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرلے تو یہاں کی شہریت کے ساتھ اپنے ملک کی شہریت بھی باقی رکھ سکتا ہے، یعنی بہ یک وقت وہ دو ملکوں کی شہریت کا حامل ہوسکتا ہے، دو پاسپورٹ رکھ سکتا ہے، اس لیے غیر مسلم ملک کی شہریت سے لازم نہیں آتا کہ وہ اسلامی ریاست اور اس کے نظامِ قانون سے بھی دست بردار ہوگیا ہو۔

(ج) جہاں تک غیر مسلم ملکوں میں عسکری ملازمت کا مسئلہ ہے تو اولاً جو ملک ہر قسم کے مطالبات اور جملہ حقوق فراہم کرتا ہے، اس کے لیے 'الغرم بالغنم' کے اصول پر اس ملازمت کا مطالبہ بے جا نہیں ہے۔ نیز فوجی ملازمت میں اگر کچھ نقصانات ہیں تو فوائد اس سے زیادہ ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آج بڑی طاقتوں کے پاس جو فنونِ حرب اور جنگی صلاحیتیں ہیں، مسلمان فوج کا حصہ بن کر ان سے کافی استفادہ کرسکتے ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی بڑی ضرورت ہے، اس لیے کہ بڑی طاقتوں کے مقابلے کے لیے جو ضروری تیاریاں اور جنگی صلاحیتیں ہونی چاہئیں وہ ہماری مسلم افواج اور حکومتوں کے پاس مفقود ہیں، اس لیے غیر مسلم ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو اگر ایسے مواقع ہاتھ آتے ہیں تو ان کو ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ فقہ کا اہم ترین ضابطہ ہے:

المصلحة العامة مقدّمة على المصلحة الخاصة۔ ۳۷ مصلحت عام مصلحت خاص پر مقدم ہوتی ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم افواج میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہو تو ان کے لیے مسلم ممالک پر فوج کشی اتنی آسان نہ ہوگی جس قدر آج محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے أخفّ الضررین کے اصول پر عسکری ملازمت کی وجہ سے مسلمانوں کو بددل نہیں ہونا چاہئے۔ علاوہ ازیں فوجی ملازمت سے کنارہ کشی کی وجہ سے ان پر غداری اور دیگر الزامات بھی لگ سکتے ہیں، جو بہ حیثیت قوم سخت نقصان دہ ہیں اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں بھی اس سے خلل پڑسکتا ہے، اس لیے 'لاضرر ولاضِرار' کے ضابطہ پر مسلمانوں کو فوجی ملازمت سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

پھر ہر ملک میں فوجی ملازمت کا جبری اصول نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر ملکوں میں اس معاملے کو انسان کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے قیام کے لیے ایسے ملک کا انتخاب کریں جہاں فوج کی جبری ملازمت کا قانون نہیں ہے۔ فوجی ملازمت کی صورت میں بھی مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالات میں فوجی مہم میں شرکت سے معذرت کردیں، اس لیے کہ تمام ملکوں نے حرّیتِ ادیان کا اصول تسلیم کرلیا ہے اور فوج میں باقاعدہ مذہبی رہ نما رکھے جاتے ہیں۔ ان کے لیے مساجد اور بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، غرض اس طرح کے جتنے شبہات وخطرات پیش کیے جاتے ہیں، ان تمام کا مناسب حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام یا وہاں کی شہریت 'شجر ممنوعہ' ہرگز نہیں ہے۔ البتہ مسلمانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ اگر وہ کسی مسلم ملک میں قیام پذیر ہیں اور وہاں کے حالات ان کے لیے پریشان کن نہیں ہیں تو اپنے ملکوں میں ہی قیام کریں اور اسلامی نظام قانون کے تحت زندگی گذاریں۔ دوسرے ملکوں کا سفر یا قیام عارضی طور پر محض ضرورت کے بہ قدر کریں۔ ان حالات میں غیر مسلم ملکوں میں مستقل قیام یا شہریت کا حصول کراہت سے خالی نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی کے لیے ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ مسلم ملکوں میں قیام اس کی پریشانیوں کا باعث ہو اور کسی غیر مسلم ملک میں اس کے لیے بہتر مواقع میسر ہوں تو اس کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنے کی گنجائش ہوگی، بہ شرطے کہ:

(۱) وہاں رہ کر اس کا دینی تشخص اور اسلامی وجود مجروح نہ ہو اور مستقبل قریب میں اس کے یا اس کی اولاد یا اس کی عزت ووقار کے لیے دینی اعتبار سے کوئی خطرہ نہ ہو۔

(۲) مسلمان وہاں دین وملت کا صحیح نمائندہ ہو اور اپنے اخلاق وعمل اور خلوص و صداقت سے اسلام کا آئینہ دار ہو، تاکہ اس کے اثرات اس کے غیر مسلم پڑوسیوں پر پڑیں۔

(۳) ترکِ وطن کو وہ ہجرتِ حبشہ کی طرح پاک مقاصد کے لیے اختیار کرے اور اپنے احساسات واعمال کے ذریعہ اس نقل مکانی کو اپنے اور ملت اسلامیہ کے لیے ہر طرح مفید اور بامقصد ثابت کرے۔

معاشی مقاصد کے تحت ترکِ وطن

اس حکم میں معاشی مجبوریوں کے تحت نقل مکانی بھی شامل ہے،:

(الف) بشرطے کہ کسی مسلمان کے اپنے ملک میں اس کی معاش کے ضروری وسائل میسر نہ ہوں، اس کی بنا پر مجبوراً وہ کسی غیر مسلم ملک چلا جائے اور اپنے دینی تشخص کی حفاظت کے ساتھ وہاں کی اقامت یا شہریت اختیار کرے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے۔ ۳۸؎

اس لیے کہ کسبِ معاش بھی ایک اہم ترین فریضہ ہے۔ اس کے لیے شریعت نے کسی مکان کی قید نہیں رکھی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَیْهِ النُّشُورُ (الملک:۱۵)

وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع بنایا۔ پس اس کے کاندھوں پر چلو اور اس کی دی ہوئی رزق استعمال کرو اور اسی کی طرف پھر اٹھایا جانا ہے۔

(ب) البتہ اگر کسی شخص کے اپنے ملک میں اس کے لیے وسائلِ معاش میسر ہوں، لیکن زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی غرض سے وہ کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت کا خواہاں ہو تو ظاہر ہے کہ یہ صورت کراہت سے خالی نہیں ہے، اس لیے کہ غیر مسلموں کے عقائد اور تہذیب وکلچر سے بچنا ہر کسی کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے اثرات اس سے زیادہ اس کے اہل وعیال پر پڑ سکتے ہیں۔ حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من جامع المشرک وسکن معهٗ فإنهٗ مثلهٗ۔ ۳۹؎

جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہو اور سکونت رکھے وہ اسی کی طرح ہے۔

علامہ خطابیؒ (م ۳۸۸ھ) اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفیه دلالة علیٰ کراهة دخول المسلم دار الحرب للتجارة والمقام فیها أکثر من مدة أربعة أیام۔ ۴۰؎

حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی مسلمان کے لیے تجارت کی غرض سے دارالحرب کا سفر کرنا یا وہاں چار دن سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے۔

اس سے یہ رہ نمائی ملتی ہے کہ محض دولت کی ہوس اور زیادہ سے زیادہ امیر بننے کی آرزو میں غیر مسلم ملک کی سکونت وشہریت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(ج) اگر کسی شخص کو بنیادی وسائلِ معاش اپنے ملک میں میسر ہوں، جس سے فاقہ کی نوبت تو نہ آتی ہو، مگر وہ اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی پوزیشن بہتر کرنے کے لیے کسی غیر مسلم ملک میں اقامت وسکونت اختیار کرنا چاہیے، اس صورت میں صرف عارضی قیام وسکونت کی گنجائش نظر آتی ہے، جیسا کہ بعض علماء نے اس کی صراحت کی ہے۔ ۴۱؎ لیکن مستقل سکونت اور باقاعدہ شہریت کی اجازت دینا اس صورت میں بہت مشکل ہے۔

(د) تجارتی مقاصد کے تحت غیر مسلم ملکوں کا سفر اور وہاں قیام کی جمہور علماء کے نزدیک اجازت ہے، لیکن یہ بھی وقتی قیام کی حد تک ہے۔ ۴۲؎

امام مالکؒ اور علامہ ابن حزمؒ کو وقتی قیام سے بھی اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک علی الاطلاق دنیوی اغراض کے لیے غیر اسلامی ملک میں قیام کرنا جائز نہیں ہے۔ ۴۳؎

دراصل جمہور فقہاء کے پیش نظر عہد نبوی کے بعض واقعات ہیں، جن میں بعض صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے مختلف اغراض کے تحت غیر مسلم ملکوں میں اقامت اختیار کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں فرمائی۔ اس لیے کہ ان کے لیے دینی فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا، یا یہ کہ ان کا وہاں قیام کرنا زیادہ مفید تھا، مثلاً حضرت عباسؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی اور مکہ میں رہتے ہوئے اپنے اسلام پر قائم رہے۔ ۴۴؎ اسی طرح نجاشی نے بھی قبولِ اسلام کے بعد مدینہ ہجرت نہیں کی اور اپنی غیر اسلامی مملکت میں مقیم رہے۔ ۴۵؎

بالخصوص آج کے دور میں مسلم ممالک تجارت وصنعت کے میدان میں جس قدر پس ماندہ ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ مسلم تجار ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں کا دورہ کریں، وہاں قیام کریں اور اعلیٰ صنعتوں سے روشناس ہوں۔ یوں بھی تجارتی بنیادوں پر متعلقہ افراد کی آمدورفت اور اشیاء کا تبادلہ اس دور میں ملک کی ترقی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تجارت اگر پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اسلامی

اصولوں کے مطابق کی جائے تو غیر مسلم برادری پر اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھے اثرات پڑیں گے۔ اس سے دعوت کی راہ کھلنے کے بڑے امکانات ہیں۔ ماضی میں تجارت ہی کے عنوان سے ہمارے اسلامی قافلوں نے مختلف ملکوں کا سفر کیا اور انہی قافلوں کے ذریعہ اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پہنچا۔ اس لیے تجارت آج کے دور میں دعوت کا بہترین وسیلہ ہے۔ اس وسیلہ کو کھو دینا ہرگز دانش مندی نہیں ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ ضرورت وقتی قیام سے بھی پوری ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے مستقل شہریت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص تجارت کو محض وسیلۂ دعوت کے طور پر اختیار کرے تو اس کے لیے بلاشبہ غیر مسلم ملکوں کی شہریت نہ صرف جائز، بلکہ باعث فضیلت ہوگی۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دینا

ایک سوال یہ ہے کہ کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ فقہاء نے اس مسئلہ کو بہت پہلے صاف کر دیا ہے۔ ہماری تمام فقہی کتابوں میں 'اہل ذمہ' کا باقاعدہ باب قائم کیا گیا ہے اور ان سے متعلق احکام کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ذمی ہر ایسے غیر مسلم کو کہتے ہیں جس کو حکومت (اور حنفیہ کے نزدیک کسی بھی مسلمان) کی طرف سے جزیہ اور اسلام کے شہری قوانین کی پابندی کی شرط پر ملک میں دائمی طور پر رہنے کی اجازت دی گئی ہو اور حکومت کی طرف سے اس کے لیے تمام تحفظات و مراعات اور حقوق و واجبات (بعض استثناءات کو چھوڑ کر) کی ضمانت حاصل ہو۔ فرد اور حکومت کے اسی قانونی رابطہ کا نام شہریت ہے۔ حنفیہ کے علاوہ تمام فقہاء اس طرح کے قانونی معاہدہ کا اختیار صرف حکومت یا امیر المؤمنین کو دیتے ہیں، جب کہ حنفیہ اس اختیار کو عامۃ المسلمین تک وسیع کرتے ہیں۔[۴۶]

بعض فقہاء نے ان شرائط کی تفصیل بھی لکھی ہے جن کی پابندی غیر مسلم شہریوں

پر ضروری ہوتی ہے۔علامہ ماوردیؒ نے ایسی چھ (٦) شرائط کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ کتابِ الٰہی کا احترام کریں اور اس کے بارے میں کسی طعن وتحریف کا تذکرہ نہ کریں۔

۲۔ ناموسِ رسالتؐ میں کوئی بے ادبی نہ کریں۔

۳۔ دینِ اسلام کی تحقیر نہ کریں۔

۴۔ کسی مسلمان خاتون سے زنا یا نکاح کا تعلق قائم نہ کریں۔

۵۔ کسی مسلمان کو دینی یا مالی فتنہ میں مبتلا نہ کریں۔

٦۔ اہلِ حرب کی مدد یا ان کے لیے جاسوسی نہ کریں۔

ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی پر ان کی شہریت منسوخ کی جاسکتی ہے۔۴۷؎

دراصل عقدِ ذمہ کو غیر مسلموں کے حق میں اسلام کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد غیر مسلموں سے حصولِ مال نہیں، بلکہ ان کو اسلامی معاشرہ میں رکھ کر اسلام کی عملی دعوت دینا ہے۔۴۸؎ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلم ملکوں کے دروازے ہر وقت غیر مسلموں کے لیے کھلے رہنے چاہئیں اور بلا کسی معقول وجہ کے اس کو بند نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ دعوتی اعتبار سے بھی فائدہ مند ہے، مالی اعتبار سے بھی، دوسرے ملکوں سے معاہدات کے اعتبار سے بھی اور اس سے خود مسلمانوں کے لیے بھی غیر مسلم ملکوں میں اقامت وشہریت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

البتہ اس معاملے میں بہ اتفاق فقہاء جزیرۂ عرب کا استثناء کیا گیا ہے۔۴۹؎ اس کی وجہ وہ حدیث پاک ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

لأخرجنّ الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب حتی لا أدع إلا مسلماً۔۵۰؎	میں یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے ضرور نکال دوں گا اور یہاں مسلمان کے علاوہ کسی کو رہنے کی اجازت نہ دوں گا۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

لایجتمع فی أرض العرب دینان ۔۵۱؎ عرب کی سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہوسکتے۔

جزیرۃ العرب اہل جغرافیہ کے مطابق عرب کے اس جزیرہ نما علاقہ کا نام ہے جس کے غرب میں بحر قلزم (بحر احمر)، جنوب میں بحر عرب اور شرق میں خلیج بصرہ (خلیج عربی) ہے۔ جانب شمال کی حد کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ صاحب معجم البلدان کے مطابق اس کی حد عذیب سے حضرموت تک ہے۔ ابن الاعرابی نے بھی اس کی تحسین کی ہے، جب کہ اصمعی کا بیان یہ ہے کہ جزیرۃ العرب طول میں عدن سے ریف عراق تک اور عرض میں ابلہ سے جدۃ تک ہے۔ ۵۲؎

اسی لیے فقہاء کرام میں حنفیہ اور مالکیہ نے جزیرۃ العرب کو صرف مکہ اور مدینہ تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ پورے خطۂ عرب (جس کو اہل بلدیات جزیرۃ العرب مانتے ہیں) کو اس میں شامل کیا ہے، اس لیے کہ الفاظِ حدیث میں عموم ہے۔ ۵۳؎ البتہ مالکیہ میں علامہ قرطبیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مکہ، مدینہ، یمامہ اور یمن کے اطراف ہیں۔ ۵۴؎ شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں اس سے مراد سرزمین حجاز ہے۔ ۵۵؎ حجاز کی تشریح امام غزالیؒ وغیرہ نے یہ کی ہے کہ اس میں مکہ، مدینہ، یمامہ، نجد اور اطراف آتے ہیں۔ الوج، طائف اور خیبر مدینہ کے اطراف میں شامل ہیں۔ یمن اس میں داخل ہے کہ نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، اس لیے کہ بعض لوگ جزیرۃ العرب کی شام وعراق تک توسیع کرتے ہیں۔ ۵۶؎

حواشی ومراجع

۱؎ المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی، دار الکتب العلمیۃ بیروت ۲۰۰۴ئ، ج ۲، ص ۳۵، ۳۶

۲؎ بدائع الصنائع للکاسانی، ج ۱، ص ۳۱۶

۳؎ شرح مختصر خلیل للخرشی، ج ۵، ص ۸۸، الشاملۃ

۴؎ مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل للحطاب الرعینی، دار عالم الکتب، باب صلاۃ السفر، ج ۲، ص ۵۰۰

۵؎ المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی، ج ۲، ص ۳۶

۶؎ البدائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیۃ للماوردی ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسی ج ۱۰، ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدین ج ۳ ص ۳۴۶، المہذب للشیرازی، ج ۲ ص ۲۵۱ وغیرہ

۷؎ حاشیۃ الدسوقی، ج ۲، ص ۲۰۶، ۲۰۷، الخرشی، ج ۳، ص ۱۵۱، کشاف القناع للبہوتی، ج ۳، ص ۱۱۴، المغنی لابن قدامۃ، ج ۱۰، ص ۵۱۷

۸؎ صحیح مسلم، ۴۷۴۰، مسند احمد، ۲۳۴۰۲، السنن الکبریٰ للبیہقی، ۱۸۲۱۰

۹؎ نہایۃ المحتاج للرملی، ج ۸، ص ۱۱۰، مغنی المحتاج للشربینی، ج ۴، ص ۲۶۴

۱۰؎ فتاویٰ ہندیہ، دار الفکر بیروت، ج ۲، ص ۱۹۷، وشرح السیر الکبیر، ج ۵، ص ۴۱، شرح الوقایۃ، ج ۶، ص ۸۰

۱۱؎ فتح القدیر لابن الہمام، دار الفکر، بیروت لبنان ۱۹۷۷ئ، ج ۵، ص ۴۶۰، وشرح السیر الکبیر، ج ۱، ص ۲۰۶، ج ۴، ص ۳۰۲

۱۲؎ شرح السیر الکبیر، ج ۴، ص ۳۰۲

۱۳؎ شرح السیر الکبیر، ج ۵، ص ۴۱

۱۴؎ صحیح مسلم، ۴۶۱۹، سنن ترمذی، ۱۶۱۷

۱۵؎ درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام، ج ۱، ص ۹۰، مادۃ ۸۷

۱۶؎ صحیح بخاری، ۳۸۵

۱۷؎ ہدایۃ مع فتح القدیر، ج ۵، ص ۳۰۳، جواہر الاکلیل، ج ۱، ص ۲۶۷، مغنی المحتاج، ج ۴، ص ۲۵۸، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ، ص ۱۴۳-۱۴۴

۱۸؎ صحیح بخاری، ۳۸۵

۲۰؎ فتاویٰ الامام محمد رشید رضا، ج ۵، ص ۱۷۵۰

۲۱؎ حکم التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ، ص ۷۱-۹۷

۲۲؎ تبدیل الجنسیۃ ردۃ وخیانۃ، ص ۲۷